International Research Journal of Religious Studies, Vol.:4, Issue: 02,July,Sep 2024 PP: 39-66

OPEN ACCESS
IRJRS
ISSN (Online): 2959-1384
ISSN (Print): 2959-2569
www.irjrs.com

شہزاد منظر کے ناولٹ "اندھیری رات کا تنہا مسافر" کا تنقیدی جائزہ

Shahzad Manzar's novel "The Lonely Traveler of Dark Night"A critical review

Dr. Shazia Sajid
Assistant Professor (Urdu Department) Kinnaird College for Women, Lahore.
Email: *shazia.sajid@kinnaird.edu.pk*

Sania Malik
Scholar (Urdu Department) Kinnaird College for Women, Lahore.
Email: *Sania.Malik@gmail.com*

Abstract

One notable figure in Urdu literature is Shehzada Manzar, who is especially well-known for his work as a writer and journalist in Pakistan. His writings span a number of genres, including critical articles that analyse human experiences and social conventions, short stories, and a well-known novelette. Manzar is a key figure in modern Urdu literature because of his writing, which is distinguished by a profound comprehension of the intricacies of social issues and human emotions. The title of his novelette is the subject of a thorough analysis in this research paper, which also examines the cultural ramifications and layers of significance it contains. The study looks at how Manzar's story captures the complex social dynamics of Pakistan, especially with regard to mental health. It draws attention to the stigma associated with mental health conditions and stresses the importance of candid communication in promoting empathy and understanding. The report emphasises the significance of mental health as a crucial component of societal health by addressing these themes. The study also explores the urgent need for open dialogue around sexual issues in Pakistani society. Since these discussions are frequently frowned upon, many people feel alone and unsupported. These conversations are sparked by Manzar's writing, which promotes an environment in which people can

open up about their experiences without worrying about being judged. According to the research, recognising and addressing sexual and mental health issues are crucial for both individual recovery and the advancement of society as a whole.This report, seen critically, promotes a change in society that would embrace and assist people who are dealing with mental health issues and sexual trauma. It urges everyone to work together to remove the obstacles preventing candid discussions in order to foster a society that is more caring and inclusive. In the end, the research's conclusions show how important literature is in shedding light on these important problems and opening the door to a more wholesome and compassionate society. Shehzada Manzar's work is one example of this.

KeyWords *Shehzada Manzar's,social conventions, mental health, shedding light, poet literature.*

موضوع کا تعارف:

ادب اور انسانی معاشرے کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ معاشرے میں ہونے والی تبدیلیاں ادب کو متاثر کرتی ہیں اور ادب بھی ان تبدیلیوں کا اثر قبول کرتا ہے۔ اسی طرح اردو ادب نے بھی دوسری زبانوں کے ادب سے نئے خیالات، نئے تجربات اور جدید اصناف کو قبول کیا ہے۔ زبان و ادب میں ترقی تب ہی ممکن ہے جب وہ جدید دور کے ساتھ چلے اور جدید چیزوں کو اپنائے۔ جس طرح ایک معاشرہ تب ہی ترقی کرتا ہے جب وہ قدیم روایات کے ساتھ ساتھ جدیدیت کو بھی اپنائے ویسے ہی ادب میں بھی ترقی تب ہی ممکن ہے جب وہ کلاسیکی ادب کے ساتھ ساتھ جدید اصناف کو قبول کرے اور مختلف زبانوں سے استفادہ کرے۔ اردو ادب نے مختلف زبانوں سے جدید اصناف قبول کی ہیں جن میں ایک ناول کی صنف ہے۔ کہانی انسانی فطرت کے بہت قریب ہے، انسان کو ابتدا سے ہی کہانی سننا اور سنانا پسند ہے۔ جوں جوں انسان نے ترقی کی یہ عمل بھی ترقی کرتا گیا اور مختلف اشکال میں تبدیل ہوتا رہا۔ پہلے وہ ایک دوسرے کو کہانیاں سناتے تھے پھر جب انسان نے ترقی کی اور لکھنا شروع کیا تو اس عمل نے بھی تحریری شکل اختیار کرلی۔

اگر اردو نثر کی بات کی جائے تو اس کا باقاعدہ آغاز جنوبی ہندوستان سے صوفیائے کرام کے مذہبی رسائل سے ہوا۔ ملّا وجہی کی "سب رس" کو اردو نثر کی پہلی باقاعدہ تصنیف تسلیم کیا جاتا ہے۔ اردو نثر کی ابتداء داستان سے ہوئی اور اس داستان کی شروعات ان منظوم قصوں سے ہوتی ہے جو دکن میں تحریر کیے گئے۔ ان داستانوں اور قصوں میں حسن و عشق اور مافوق الفطرت عناصر شامل تھے جو ان کو قاری کے لیے دلچسپ بناتے ہیں۔ اس دور کے انسان کے پاس تفریح کے لیے ان داستانوں کو سننے اور کہنے کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہ تھا اس لیے ان کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ اپنے کام کاج سے فارغ ہونے

کے بعد طویل داستانیں سن سکیں۔ مگر آج کے اس تیز رفتار دور کے انسان کے پاس نہ تو اتنا وقت ہے اور نہ ہی اتنی برداشت کہ وہ ان طویل داستانوں کو پڑھ سکے۔ اس لیے داستان نے ترقی کرتے ہوئے ناول کی شکل اختیار کرلی جو کہ اس کی نسبت کم طویل اور تھوڑے عرصے میں پڑھا جاسکتا ہے۔

ناول ان داستانوں کی جدید شکل ہے جو اپنے عروج کی طرف جارہی ہے۔ ناول انگریزی زبان کا لفظ ہے جو فرانسیسی لفظ نوویلا سے نکلا ہے۔ اردو ادب میں ناول کی صنف انگریزی ادب کے ذریعے سے متعارف ہوئی ہے۔ ناول کی لغوی معنی "نیا" کے ہیں جبکہ اصطلاح میں ناول ایک ایسی نثری کہانی کو کہتے ہیں جس میں ہونے والے واقعات میں ایک ربط قائم ہوتا ہے اور ایک مکمل عہد کی تصویر پیش کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنی کتاب "اردوناول نگاری" میں ناول کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

> "فن کی رو سے ناول اس نثری قصے کو کہتے ہیں جس میں کسی خاص نقطۂ نظر کے تحت زندگی کی حقیقی وواقعی عکاسی کی گئی ہو۔"(۱)

عام زبان میں ناول اس طویل قصے یا کہانی کو کہا جاتا ہے جس میں مختلف کرداروں کے ذریعے معاشرے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور جس کے ذریعے سے قاری کو ایک عہد کی مکمل تصویر ملتی ہے۔ ناول کی یا کسی بھی فن پارے کی اہم بات یہ ہے کہ وہ جس بھی دور میں لکھا گیا ہوتا ہے اس دور کا مکمل عکس اس فن پارے میں نظر آتا ہے۔ اگر کسی مخصوص عہد پر نظر ڈالنی ہو تو اس عہد کے ادب کے ذریعے اس دور کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ادب کسی بھی دور یا معاشرے کی تہذیب، سماج اور سیاسی حالات کا مکمل عکاس ہے۔

ایک عہد کی تاریخ مؤرخ سے بہتر ادیب پیش کرتا ہے کیونکہ مؤرخ کا کام صرف تاریخ لکھنا ہے جبکہ ادیب تاریخ کے ساتھ ساتھ اس عہد کے لوگوں کی تہذیب، عام انسان کی سوچ اور تاریخ میں ہونے والے واقعات کا انسانی سماج پر اثر بھی قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔

موضوع کے حوالے سے ناول کی بات کی جائے تو ناول کے موضوعات کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہے جتنا کہ زندگی کا۔ زندگی کا تعلق حرکت سے ہے اس طرح ناول کے موضوعات کا تعلق بھی انسانی زندگی میں ہونے والی اس حرکت اور ہلچل سے ہے۔ ناول کا کینوس بہت وسیع ہے اس لیے انسانی زندگی کا ہر موضوع ناول کے موضوع میں شامل ہے۔ ناول نگار انسانی زندگی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ناول تحریر کرتا ہے۔ ناول میں ہمیں انسانی زندگی کا مکمل عکس ملتا ہے۔ کیونکہ قاری ناول میں موجود کرداروں میں خود کو تلاش کرتا ہے اگر ان کرداروں کا تعلق انسانی زندگی سے اور معاشرے سے ہوگا تو قاری دلچسپی سے اس تحریر کو دیکھتا ہے۔ انسانی زندگی کے ساتھ معاشرے میں ہونے والے مسائل اور اثرات کو بھی ناول کے موضوع کا

حصہ بنایا جاتا ہے۔ کیونکہ جب بھی کسی فن پارے کو دیکھا جائے تو یہ امید کی جاتی ہے کہ اس سے اس خاص دور کی عکاسی ہو سکے۔

ڈاکٹر محمد یٰسین نے ناول اور زندگی کے تعلق کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"ناول اور زندگی کے درمیان چولی دامن کا ایسا ساتھ ہے کہ اس میں تاریخی، سماجی، سیاسی، معاشی، ثقافتی، نفسیاتی، جذباتی غرض انسانی زندگی کے ہر پہلو کی تصویر کشی کی جا سکتی ہے۔"(۲) ناول حقیقی زندگی کو تخلیق کا اور تخلیقی کام کو زندگی کا روپ دینے کا نام ہے۔ چونکہ ناول کے ذریعے سے زندگی کی مکمل تصویر اور مختلف پہلوؤں کو دیکھا جا سکتا ہے اس لیے ناول کو زندگی کی تفسیر کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

ناول چونکہ طویل صنف ہے جس کو ایک نشست میں مکمل نہیں کیا جا سکتا وقت کو دیکھتے ہوئے ناول نگاروں نے ناول کے جیسے ہی مگر مختصر قصے لکھنے شروع کیے جس کو "ناولٹ" کا نام دیا گیا۔ ناولٹ میں سارے عناصر ناول کی طرح ہی موجود ہیں مگر ناولٹ ناول کی نسبت چھوٹا ہے۔ اس کو ناول کی جدید شکل کہا جا سکتا ہے جو ناول کی نسبت قدر مختصر ہوتا ہے۔ ناولٹ انگریزی زبان کا لفظ ہے جو ناول سے نکلا ہے جس کے معنی "چھوٹا یا مختصر ناول" کے ہیں۔ انگریزی زبان میں اس کے لیے شارٹ ناول کا لفظ استعمال ہوتا ہے. ناولٹ عصر حاضر کی پیداوار ہے جس کی تعریف ڈکشنری آف لٹری ٹرمز میں یوں کی گئی ہے:

"A form of folk-tale of the Semitic tradition which is of a particular time and place. It lacks universality." (3)

اس تعریف سے مراد ہے کہ ایسی لوک کہانی جو ساقی تہذیب سے تعلق رکھتی ہو اور ایک مخصوص وقت اور مقام کے گرد گھومتی ہو۔ اس تعریف سے ناولٹ کا مطلب باقاعدہ طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ ناولٹ میں صرف ایک مخصوص طبقے کی ایک مخصوص وقت کی کہانی پیش کی جاتی ہے۔

ناولٹ سے مراد مختصر ناول ہے اس لیے اس کے عناصر بھی ناول سے ملتے جلتے ہیں۔ ناولٹ میں بھی ناول کی طرح وہی کردار، پلاٹ، منظر نگاری ہوتی ہے بس ناول کی نسبت ناولٹ طویل نہیں ہوتا۔ شاد امرتسری لکھتے ہیں:

"ناولٹ کے لفظ سے ہی ظاہر ہے کہ یہ ایک چھوٹا ناول ہے ناول کی تمام تکنیک اس میں کار فرما ہے، وہی کردار، وہی کرداروں کے مکالمے مگر ناول کی ضخامت سے کم ہو گی"۔(۴)

بے شک ناول اور ناولٹ میں زیادہ فرق نہیں کیا جاتا سوائے ضخامت کے۔ دونوں کا کینوس مختلف ہوتا ہے، دونوں کا موضوع تو ایک ہو سکتا ہے لیکن ناول میں وہ موضوع مختلف انداز میں پیش کیا جائے گا اور ناولٹ میں کسی اور انداز میں۔ ناول نگار ہر چھوٹی سی چھوٹی چیز کی جزئیات نگاری کرتا ہے، ناول میں ہر واقع کی تفصیل موجود ہوتی ہے اس کے برعکس ناولٹ نگار اسی موضوع کو ایسے پیش کرتا ہے جیسے کوزے میں سمندر سمو گیا ہو۔ ناولٹ نگار کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ ایک مخصوص دائرے میں رہتے ہوئے اُس موضوع کو ایک دائرے میں سمو کر پیش کرے۔

ادب کی کوئی بھی صنف ہو ادیب ہمیشہ اپنے معاشرے کے حالات اور مسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے ہی اپنی تحریر کا موضوع منتخب کرتا ہے۔ ناول اور افسانہ نگار کی طرح ناولٹ نگار بھی اپنے ارد گرد ہونے والے معاملات کو محسوس کرتا ہے، ان کا مشاہدہ کرتا ہے اور جو اثر ان سے قبول کرتا ہے اس کو اپنی تحریر میں لاتا ہے۔ ناولٹ نگار بہت کم کینوس میں وہ سب بیان کرتا ہے جس کے پیچھے ایک خاص مقصد ہوتا ہے۔ ناول اور افسانے کی طرح اردو ناولٹ کا بھی انسانی زندگی اور معاشرے سے گہرا تعلق ہے۔ ناولٹ کی روایت ناول کی نسبت دور کی ہے کیونکہ اردو ناولٹ کو آزادی کے بعد زیادہ فروغ ملا۔ ناولٹ کی تاریخ پر تحقیق سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ناولٹ کے ارتقاء کو دو ادوار پر تقسیم کیا جاتا ہے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کی ناولٹ نگاری۔

آزادی سے پہلے زیادہ تر توجہ ناول اور افسانے پر دی جاتی رہی۔ اس عرصے میں ناولٹ کو نظر انداز کیا جاتا رہا جس وجہ سے ناولٹ کی ارتقائی رفتار ناول اور افسانے کی نسبت سست تھی۔ اردو ناولٹ نگاری میں سب سے پہلا نام نیاز فتح پوری کا آتا ہے۔ بیسویں صدی کے اغاز میں معاشرتی انقلاب کے لیے دو رجحانات سامنے ائے ایک تو سرسید کی تحریک کی شکل میں مقصدیت کا رجحان تھا جس میں پریم چند کے افسانے اور ناول مقصدیت طرز کے تھے۔ اس کے برعکس رجحان کی دوسری شکل جو مقصدیت کے زیر اثر ابھر اوہ رومانیت کا رجحان تھا۔

اس رجحان کی قیادت نیاز فتح پوری نے کی۔ ان کا پہلا ناولٹ "ایک شاعر کا انجام" 1913ء میں لکھا گیا۔ ان کا دوسرا ناولٹ "شہاب کی سرگزشت" تھا جو زیادہ مقبول ہوا۔ انھوں نے اپنے منفرد اسلوب سے بہت سے نئے لکھنے والوں کو متاثر کیا اور انھیں ایک نئی راہ دکھائی۔ وہ جمال پرست اور رومانیت کے قائل تھے ان کی تحریروں میں جمالیت کا عنصر نمایاں ہے۔ اردو نثر کو مقصدیت سے ہٹا کر رومانیت کی راہ دکھانے والے نیاز فتح پوری ہی ہیں۔

نیاز فتح پوری کے بعد کشن پرشار کول کے ناولٹ "شامہ" میں فکر و فن کی خوبصورت آمیزش ہے جس میں موضوع اور تکنیک دونوں کو منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ناولٹ کا مقصد ہندوستان کی خواتین کی مجبوریوں اور مظلومی کو پیش کرنا تھا جو کہ صاف اور واضح طور پر پیش کی گئی ہے۔ انھوں نے واقعات کو پھیلاؤ سے پیش کرنے کی بجائے ان کو سمیٹ کر ایک موضوع کے ساتھ پیش کیا ہے۔

پرشاد کول کے بعد بہت سے ناولٹ نگار سامنے آئے مگر ان کے ناولٹوں میں "شاما" جیسی بات نہ تھی۔ ان کے بعد سجاد ظہیر کے ناولٹ "لندن کی رات" سے اردو ناولٹ کو فروغ ملا جس میں منفرد اسلوب کے ساتھ شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال بھی کیا گیا۔ چونکہ اس سے پہلے ناول اور ناولٹ میں خاص فرق نہیں کیا جاتا تھا اس وجہ سے پہلے اس ناولٹ کو ناول تسلیم کیا جاتا رہا مگر جدید تحقیق کے مطابق "لندن کی رات" ایک ناولٹ ہے جو ناول کی بجائے ناولٹ نگاری کے فنی تقاضوں پر پورا اترتا ہے۔ سجاد ظہیر کے دور میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا جس کے زیر اثر بہت سے مصنفین نے حقیقت پسندی کو سامنے رکھ کر انسانی مسائل اور ان مسائل کے اثرات کو دیکھتے ہوئے ادب میں نئے موضوعات متعارف کروائے۔ اسی دور میں عصمت چغتائی اور انتظار حسین کے ناولٹ بھی سامنے آئے۔ عصمت چغتائی کا ناولٹ "ضدی" اسی دور کی پیداوار ہے مگر اس میں حقیقت پسندی کی بجائے رومانی پہلو زیادہ ہیں۔ انتظار حسین کا ناولٹ "دن" اس ترقی پسند دور کا ایک نمایاں ناول ہے جس میں انھوں نے پنجاب کے ایک مخصوص مسلم معاشرے کو دلکش انداز میں پیش کیا۔

اردو ناولٹ کے ارتقاء میں یہ کوشش آزادی سے پہلے کی ہے۔ تقسیم کے بعد جس طرح باقی اصناف جیسے ناول اور افسانے میں بڑی تبدیلیاں آئیں ویسے ہی اس کا اثر ناولٹ پر بھی ہوا۔ ہمارے معاشرے میں ہونے والی ہر چھوٹی بڑی تبدیلی کا اثر ادب پر ہوتا ہے کیونکہ ادب اور معاشرے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تقسیم ہند نے معاشرے کے ہر طبقے کے لوگوں کو متاثر کیا اس کا اثر ادب پر بھی نمایاں تھا۔ آزادی کے بعد ناولٹ نگاروں نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا۔ راجندر سنگھ بیدی کا ناولٹ "ایک چادر میلی سی" اس کی بہترین مثال ہے۔ یہ ناولٹ تو آزادی کے بعد لکھا گیا مگر اس میں انھوں نے آزادی سے پہلے کے ایک خاص ہندو معاشرے کے ایک دیہات کی تصویر دکھائی ہے جس میں اس گاؤں کی روایات اور معاشرت سے متعارف کروایا گیا ہے۔ لوگوں کے مسائل کو باریک بینی سے پیش کیا گیا ہے جس سے بیدی کے فن کی مہارت واضح ہو جاتی ہے۔ اس دور میں بیدی کے علاوہ اور بھی ناولٹ سامنے آئے جن میں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کا "نئے ضرر"، شوکت صدیقی کا "کمیں گاہ"، جمیلہ ہاشمی کا "آتش رفتہ"، ذکاالرحمٰن کا "ڈپٹی کمشنر" قابل توجہ ہیں۔

اردو ناولٹ کو حقیقت پسندی سے قریب تر کرنے والوں میں شوکت صدیقی کا نام بہت اہم ہے۔ انھوں نے اپنے ناول اور افسانوں میں معاشرے کے حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔ "کمیں گاہ" ان کا معیاری ناولٹ ہے جو فنی و فکری حوالے سے باقی ناولٹوں سے بلند مقام رکھتا ہے۔ یہ لکھنوی دور کے ایک مخصوص دور کے معاشرے کی تصویر پیش کرتا ہے۔ کلاٹ کردار وحدت تاثر کے حوالے سے بہترین ناولٹ ہے۔

جمیلہ ہاشمی کا نام اردو ناولٹ نگاری میں اہم ہے ان کا ناولٹ "آتش رفتہ" پنجاب کی عوامی زندگی اور اس معاشرے کے رسم و رواج کو دیکھنے کے لیے آئینے کا کام کرتا ہے۔ فنی لحاظ سے اس ناولٹ میں کمی ہے مگر اس میں پنجاب کے لوگوں کی

زندگی کی ترجمانی بہترین طریقے سے کی گئی ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے ناول کے فن کو مد نظر رکھ کر یہ ناولٹ تحریر کیا ہے اسی وجہ سے اس میں ناول نگاری کے پہلو زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

کرشن چندر کا نام بھی ممتاز ناولٹ نگاروں میں آتا ہے ان کا 13 ابواب پر مشتمل ناولٹ "پیار ایک خوشبو" رومانی تخلیق کی ایک بہترین مثال ہے۔ اس میں کشمیر کی علاقائی زندگی پیش کی گئی ہے جو ہندوستان کے معاشرے سے مختلف ہے۔ واقعات کی ترتیب اس طرح سے کی گئی ہے کہ قاری تجسس کا شکار رہتا ہے، واقعات کو آخر میں سمیٹ کر ایک تاثر میں پیش کیا گیا ہے جس وجہ سے قاری پر اس کا اثر دیر تک رہتا ہے۔

اسی عرصے میں خواجہ احمد عباس کا ناولٹ " تین پہیے، ایک پرانا ٹپ اور دنیا بھر کا کچرا" سامنے آیا جس میں بمبئی کی معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس میں کئی ضمنی عنوانات ہیں ہر عنوان کے بعد ایک نیا رخ سامنے آتا ہے جس میں نیا واقعہ پیش کیا گیا ہے مگر ترتیب ایسے کی گئی ہے کہ سب واقعات آپس میں کڑی کی طرح مل جاتے ہیں اور ایک ہی تاثر قائم کرتے ہیں۔

سہیل عظیم کا ناولٹ "بے جڑ کے پودے" مہاجر بچوں کے مسائل پر لکھا جانے والا ناولٹ ہے۔ سہیل عظیم بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار تھے ان کے افسانوں میں جو مقصدیت تھی وہی اُن کے اس ناول میں بھی نظر آئی۔ اس ناولٹ کے ذریعے معاشرے کے سنگین مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے مگر فنی لحاظ سے یہ کامیابی حاصل نہ کر سکا۔

آزادی کے بعد جوگندر پال بھی نمائندہ ناولٹ نگار میں آتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار تھے مگر اس کے ساتھ ناولٹ کے شعبے میں بھی طبع آزمائی کی اور دو ناولٹ تحریر کیے۔ "آمد آمد" اور "بیانات" ان کے دو ناولٹ ہیں جن میں ہندوستان کے لوگوں اور ان کی تہذیب کا عکس موجود ہے۔

اردو فکشن میں قرۃ العین حیدر کا نام قابل ذکر ہے۔ انھوں نے اردو ناول، افسانہ اور ناولٹ میں اپنا نام کمایا۔ اردو ادب میں قابل قدر اضافے کیے کہ جن کے ذکر کے بغیر اردو فکشن نامکمل ہے۔ ان کے ناولٹ "دلربا" اور "سیتا ہرن" معیاری ناولٹ ہیں۔ دل ربا میں انھوں نے اودھ کی جاگیر دارانہ تہذیب کی ختم ہونے والی قدروں کو دکھایا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریر کے ذریعے کسی خاص طبقے کی تصویر پیش کی ہے۔ ان کے ناول ہوں یا ناولٹ قاری ان کو پڑھ کر ان کی طرف متوجہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

اردو ناولٹ میں شہزاد منظر کا ناولٹ "اندھیری رات کا تنہا مسافر" بھی معیاری ناولٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایک صحافی تھے مگر ان کی تحریر میں جو ضبط و توازن ہے وہ حیران کن ہے۔ ناولٹ میں انسانی زندگی کے سنگین حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ صحافی ہونے کے باوجود ناولٹ کے جو فنی تقاضے پورے کیے گئے ہیں وہ قابلِ تعریف ہیں۔

جدید دور کے ناولٹ نگاروں میں اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی، طاہر جاوید مغل اور بانو قدسیہ کا نام قابلِ ذکر ہے۔ اشفاق احمد افسانہ نگار تھے مگر انھوں نے ناولٹ کے فن میں بھی قدم جمائے۔ احمد ندیم قاسمی کا ناولٹ "رئیس خانہ" انسانی

نفسیات کے اظہار کا ایک نمونہ ہے۔ بانو قدسیہ کے بغیر اردو فکشن کی روایت مکمل نہیں ہوتی ان کا ناولٹ "ایک دن" اردو ناولٹ نگاری میں معیاری ناولٹ کی فہرست میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ صادق حسین، ڈاکٹر خالد سہیل اور بہت سے ناولٹ نگار عصرِ حاضر میں اہم ناولٹ نگار تسلیم کیے جاتے ہیں جو اردو ناولٹ میں قابلِ قدر اضافے کرتے ہوئے اس کو نئی راہ پر گامزن کر رہے ہیں۔

شہزاد منظر باقاعدہ طور پر ایک صحافی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں مگر ان کا ادب میں جو کام موجود ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ صحافت کے ساتھ ساتھ ان کا لگاؤ ادب سے بھی تھا۔ اصل نام ابراہیم عبد الرحمن عارف تھا۔ جب لکھنا شروع کیا تو پہلے " تبسم عارف" اور "عمر خیام" قلمی نام کے طور پر استعمال کیے مگر بعد میں شہزاد منظر استعمال کیا اور آج تک اسی نام سے جانے جاتے ہیں۔ یکم جنوری 1933ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے اور ادھر ہی پرورش پائی۔ ان کا تعلق ایک کاروباری گھرانے سے تھا جن کی کلکتہ جیسے بڑے شہر میں کافی جاگیریں تھیں۔ دادا نے کاروبار کو خوب آگے بڑھایا مگر والد صاحب جائیداد کا بڑا حصہ اپنی شراب نوشی کی لت میں اڑا چکے تھے جس وجہ سے شہزاد منظر کو اپنی زندگی میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جب وہ کلکتہ سے ڈھاکہ گئے تو اس وقت خالی ہاتھ تھے قلم کے علاوہ ان کی جیب میں کچھ نہ تھا۔

اپنی زندگی میں انہوں نے بہت کڑے دن دیکھے ہیں مگر اس کے باوجود ہمت سے کام لیا اور کوئی غلط کام نہیں کیا جس سے ان کی شان میں کوئی فرق آتا۔ مالی لحاظ سے بہت مشکلات کا سامنا کیا لیکن کسی سے قرض لینا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ وہ مطالعے کے شوقین تھے یہ شوق بچپن ہی سے ان میں موجود تھا۔ وہ دانچی لائبریری میں مختلف کتابیں اور رسالے پڑھنے کے لیے جاتے تھے۔ اپنے اسی شوق کی تکمیل کے لیے ہی انھوں نے کسی سے ادھار لیا۔ کسی کتاب کی کاپی کروانے یا خریدنے کے لیے ہی اپنے دوستوں سے ادھار مانگتے تھے کیونکہ انھیں ہر حال میں کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔

ان کے مزاج کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ بہت جلد دوست بن جاتے تھے۔ جو کوئی ان سے ملتا خود بخود ان کا دوست بن جاتا۔ ان کے اخلاق کی وجہ سے ہر کوئی انھیں پسند کرتا، جس خاندان سے ان کا تعلق ہوتا مردوں کے علاوہ وہ اس گھر کی عورتوں اور بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتے اسی لیے ہر بچہ ان کے آنے کا انتظار کرتا۔ اپنے چاہنے والوں، قریبی دوستوں اور رشتہ داروں کے ہاں ہر عید تہوار پر جاتے اور بچوں کو ہر عید پر عیدی بھی لازمی دیتے۔ اس سے ان کی اپنے دوست احباب سے محبت اور ان کے رکھ رکھاؤ کا پتہ چلتا ہے۔

دوسروں کی بات کو اہمیت دیتے اور اگر کوئی گفتگو کرتا تو اس کی گفتگو دھیان سے سنتے اس میں مخل نہ ہوتے اس وجہ سے دوسروں سے بھی یہی توقع کرتے کہ دوسرے بھی اُن کی بات دھیان سے سنیں اور اگر کوئی درمیان میں بات چیت کرتا یا سرگوشیاں کرتا تو برا محسوس کرتے اور انھیں ڈانٹ کر چپ کرواتے۔

شہزار منظر نے اپنے پیشے صحافت کا آغاز کلکتہ سے کیا۔ اس کے بعد جب وہ ڈھاکہ آئے تو ادھر بھی اسی پیشے کو جاری رکھا۔ انھوں نے اخبارات میں مختلف عہدوں پر کام کیا۔ جس کی تفصیل اس طرح سے ہے:

1. روزنامہ "عصرِ جدید" کلکتہ (رپورٹر) 1956 سے 1960ء

2. روزنامہ "آزاد ہند" کلکتہ (رپورٹر) 1960 سے 1964ء

3. ہفت روزہ "آثار" کلکتہ (مفاون مدیر) 1959 سے 1963ء

4. روزنامہ "پاسبان" ڈھاکہ (سب ایڈیٹر) 1964 سے 1965ء

5. روزنامہ "وطن" ڈھاکہ (اسسٹنٹ ایڈیٹر) 1970 سے 1971ء

6. ہفت روزہ "چترالی" ڈھاکہ (اسسٹنٹ ایڈیٹر) 1965 سے 1971ء

7. روزنامہ "مساوات" لاہور (نمائندہ خصوصی، مقیم ڈھاکہ) 1970 سے 1971ء

8. روزنامہ "جنگ" کراچی (سب ایڈیٹر) 1971 سے 1972ء

9. ہفت روزہ "پیمان" کراچی (مدیر معاون) 1972 سے 1973ء

10. روزنامہ "مساوات" کراچی (اسسٹنٹ ایڈیٹر) جون 1973 سے 1979ء

11. روزنامہ "حریت" کراچی (اسسٹنٹ ایڈیٹر) 1982 سے 1983ء

12. روزنامہ "جنگ" کراچی (ادبی کالم نگار) 1981 سے 1989ء

شہزاد منظر نہایت ملنسار انسان تھے۔ زندگی میں مالی تنگی ہونے کے باوجود وہ ہر کسی سے ملتے تو اُس کی خوب آؤ بھگت کرتے۔ انھیں دعوتوں کا بے انتہا شوق تھا۔ اپنے دوستوں، چاہنے والوں کو کھانا کھلانے کے بہانے تلاش کرتے۔ ان کے دوست احباب دور دور سے ان سے ملاقات کے لیے آتے تو وہ بغیر خاطر کے جانے نہ دیتے۔ دعوت کا شوق اس قدر تھا کہ نوکری جانے پر بھی دعوت کا بندوبست کرتے۔

صحافت کے ساتھ ساتھ انھوں نے ادب میں بھی بہت کام کیا جو قابلِ تعریف ہے۔ ایک صحافی کی خوبی ہے کہ وہ ہر چیز کو نہایت باریک بینی سے دیکھتا اور اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔ عام لوگوں سے ہٹ کر سوچتا ہے اور معروضیت سے کام لیتا ہے۔ جس وجہ سے اس میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ تنقید میں بھی مہارت رکھتا ہے۔ چیزوں کو اُن کے میعار پر پرکھتا ہے اسی خوبی کی وجہ سے شہزاد منظر میں بھی ایک نقاد چھپا ہوا تھا جس کو انھوں نے سونے نہیں دیا اور تنقید کے شعبے میں بھی نام کمایا۔

ان کی ادبی زندگی کا آغاز تو 1962ء سے ان کے مقالے "البیر کامو" سے ہوا۔ جو بنگلور کے سہ ماہی رسالے "سوغات" سے شائع ہوا۔ یہ کامو وجودیت پسند مشہور ادیب تھے ان پر دوسرا کشادہ مقالہ تھا۔ یہ مقالہ انھوں نے کامو پر مکمل تحقیق کے بعد تحریر کیا جو کہ طوالت کے باعث کافی ترمیم کے بعد شائع ہوا اور "سوغات" رسالے کے 25 صفحات پر

مشتمل تھا۔ اشاعت کے بعد مقالے کی خوب تعریف ہوئی، اس کی مقبولیت کی بدولت اسے پٹنہ سے ماہنامہ "تہذیب" میں پھر سے شائع کیا گیا۔ شہزاد منظر چونکہ صحافی ہونے کی بدولت اخبارات میں بھی تنقیدی مقالے لکھتے تھے اس لیے انھوں نے ادبی تنقید میں بھی طبع آزمائی کی۔

"جدید اردو افسانے" کے عنوان سے اُن کی پہلی تنقیدی کتاب 1982 میں شائع ہوئی۔ اس سے اُن کے ادبی تنقیدی سفر کا آغاز ہوا اور اس کے بعد ان کی متعدد تنقیدی کتابیں اور تنقیدی مضامین شائع ہوئے۔ اردو تنقید نگاری میں زیادہ تر نقاد شاعری پر تنقید کرنا پسند کرتے ہیں کیونکہ شاعری کا نثر کی بدولت آسانی سے مطالعہ ہو سکتا ہے جبکہ نثر کے مطالعہ کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے اس لیے ناقدین وقت بچانے کے لیے نثر کی بجائے شاعری کی تنقید پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر شہزار منظر نے افسانے پر تنقید کا کام کیا۔

اس کتاب میں مصنف نے جدید افسانے کے فنی اور فکری مسائل کو قاری کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں افسانے کی صنف پر اور جدید اردو افسانے کو مد نظر رکھتے ہوئے اُس پر بات کی گئی ہے جبکہ دوسرے حصے میں چند افسانہ نگاروں کے فن کے ذریعے جدیدیت اور افسانے کو پیش کیا گیا ہے۔ شہزاد منظر نے یہ کتاب اپنے تنقیدی مضامین یکجا کر کے شائع کی اور یہ مضامین تب لکھے گئے تھے جب افسانے میں جدیدیت کی تحریک کی بدولت نئے اسلوب اور جدید طرز اظہار کو شامل کیا جارہا تھا۔ افسانہ روایتی طریقے سے جدید طرز کی طرف جارہا تھا۔ شہزاد منظر نے جدیدیت کے اثرات اور نئے لکھنے والوں کے مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی اور اس وقت افسانے پر تنقیدی کتاب شائع کی ... "شہزاد منظر کا مطالعہ وسیع اور نظر عمیق ہے۔ انھوں نے افسانے کے فن کا تنقیدی مطالعہ کیا ... جانب یہ پہلا سفر تھا جس ... عالمی سطح پر ... اسی وجہ سے لکھتے ہیں: یہ جائزہ اہم بھی ہے اور معنی خیز بھی۔"

جدید اردو افسانہ "اُن کے تنقیدی سفر کا آغاز تھا اس کے ساتھ ساتھ اس کتاب کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس نے نثری تنقید کے لیے راہ ہموار کی۔ افسانے پر تنقید کی دوسری کتاب "علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ" جو 1990ء میں شائع ہوئی سے اس راستے میں مزید ہمواری پیدا ہوئی۔ یہ کتاب بھی متعدد تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے جو جدید اردو افسانے کے مقابلے میں زیادہ پھیلاؤ اور تنوع سے تحریر کیے گئے ہیں۔ اس کے مضامین جدید افسانے کے مسائل پر مشتمل ہیں۔ "مشرقی پاکستان کے المیے کا اردو افسانے پر اثر" اس کتاب کا اہم حصہ ہے جس میں انھوں نے ان افسانوں کا جائزہ

تفصیل سے پیش کیا ہے جو تقسیم بنگال کے پس منظر میں تحریر کیے گئے۔ یہ مضمون حوالہ جاتی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ "فکشن کی تنقید کے مسائل" پر ان کا مضمون معلوماتی بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ منفرد بھی سمجھا جاتا ہے کیونکہ شہزاد منظر سے قبل افسانے یا فکشن پر تنقیدی کام نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کے علاوہ افسانے پر تنقید کے ساتھ ساتھ انھوں نے کئی افسانہ نگاروں پر بھی مختلف مضامین تحریر کیے ہیں جن میں غلام عباس، خدیجہ مستور، قمر عباس ندیم اور منصور قیصر وغیرہ شامل ہیں۔ فکشن خصوصاً افسانے کی تنقید پر یہ شہزاد منظر کا ایک اہم کام ہے۔ اس مجموعے میں افسانے کے ساتھ انھوں نے ناول پر بھی چند ایک مضامین شامل کیے ہیں۔ "جدید اردو افسانہ" اور "علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ" دونوں مجموعوں سے اُن کی تنقیدی صلاحیتوں اور ان کے مطالعہ کی گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔

رد عمل " کا شمار ان کے بہترین تنقیدی مجموعے میں کیا جاتا ہے جس میں انھوں نے ترقی پسند ادب سے پیکر جدیدیت پر بھی بات کی ہے۔ شہزاد منظر کی منفرد بات جو انھیں باقی نقادوں اور مصنفین سے منفرد بناتی ہے وہ یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے کارکن ہونے کے باوجود معروضیت سے کام لیتے اور جو ترقی پسند تحریک کی باتیں انھیں نامناسب یا فن کے اصولوں کے خلاف لگتی وہ اُن پر سوال اٹھاتے۔ اس میں عملی اور نظری دونوں اقسام کی تنقید کو دور حاضر کے رجحانات کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ یہ کتاب 1985ء میں شائع ہوئی۔ جس میں مصنف نے تنقید اور تخلیق کے رشتے کو بھی قاری کے سامنے پیش کیا ہے اور یہ نقطہ اخذ کیا ہے کہ تنقید کا تخلیق سے گہرا رشتہ ہے اچھی اور معیاری تنقید کو انھوں نے تخلیق کا درجہ دیا ہے۔ انھوں نے قدیم دور سے جدید دور کی تنقید کا تجزیہ کیا ہے۔ "رد عمل" کے حوالے سے آفاق صدیقی لکھتے ہیں:

> "شہزاد منظر کے مضامین ادب کے طالب علموں کو بھاری بھرکم اقوال اور چونکا دینے والے فقروں سے نہیں بلکہ سنجیدہ استدلال سے ایسے لہجے میں درس ادب دیتے ہیں جو سادگی میں بھی پرکاری کی آن بان رکھتا ہے۔"(٦)

عام طور پر تنقیدی مقالے اور مضامین میں ناقدین اپنی اہمیت بڑھانے کے لیے مشکل الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ ناقد کا کام ہے کہ وہ قاری کے سامنے فن پارے کے وہ تمام پہلو کھول کر رکھ دے جسے وہ سمجھ نہیں پایا مگر کچھ ناقدین ایسا نہیں کرتے اور تنقید سے فن پارے کو اور مشکل بنا دیتے ہیں۔ شہزاد منظر اپنے تنقیدی مضامین میں خود کو قاری کی سطح پر لا کر ہی اظہار خیال کرتے ہیں تاکہ قاری کے لیے چیزوں کو سمجھنا مزید مشکل نہ ہو۔ اگر تنقید کرتے وقت ایسی اصطلاحات استعمال ہوں گی جن کو سمجھنے کے لیے قاری کو لغت یا کسی اور ذریعے کی مدد درکار ہو تو تنقید کا مقصد اور اس کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ احمد ہمدانی اس حوالے سے کہتے ہیں:

> "جہاں تک مصنف کی تحریر کا تعلق ہے وہ بہت سادہ اور عام فہم ہے۔ عام طور پر ہم اپنی جدید تنقید کے بارے میں یہ بات آسانی سے نہیں کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ تنقید میں جگہ جگہ بڑی بڑی اصطلاحات ہوتی ہیں اور ان اصطلاحات کا استعمال کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ بات بجائے آسان ہونے کے اور مشکل ہو جاتی ہے۔ شہزاد منظر نے اس کے برعکس کوشش کی ہے کہ وہ بات کو واضح کریں اور ان اصطلاحات کو صرف اسی صورت میں استعمال کریں کہ وہ بات کی وضاحت میں ممد و معاون ثابت ہوں

مصنف نے اپنی تنقید کے ذریعے اصل کی تشریح کرنے کی بجائے فن پارے کو تخلیقی معیار کی سطح پر پرکھا ہے۔ انھوں نے جدیدیت اور اس کے پیدا ہونے والے مسائل کو مزید الجھانے کی بجائے سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے کسی بیان میں کوئی تکرار کوئی الجھاؤ نہیں، ہر بات سیدھے اور صاف انداز میں بیان کی ہے۔ وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ ناقدین کو کسی بھی تخلیق پر اپنا حتمی فیصلہ نہیں دینا چاہیے بلکہ اپنی رائے دینی چاہیئے قاری کو خود تخلیق کا مطالعہ کر کے اپنی رائے قائم کرنی چاہیئے۔

صحافت اور تنقید کے علاوہ فکشن میں بھی انھوں نے کام کیا۔ اپنے افسانوی مجموعے "ندیا، کہاں ہے تیرا دیس"، اور ناولٹ "اندھیری رات کا تنہا مسافر" سے فکشن میں نام کمایا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "ندیا، کہاں ہے تیرا دیس" 1990ء میں شائع ہوا۔ وہ ایک سماجی شعور کے افسانہ نگار تھے ان کے زیادہ تر افسانوں کا موضوع بنگال کے دیہات کے باشندوں کی زندگی، کسانوں کے مسائل، معاشی بدحالی ہے۔ سماج کے مسائل کے ساتھ ان کے متعدد افسانے بنگال کی تاریخ پر بھی ملتے ہیں۔ شہزاد منظر نے اپنے معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اس لیے اُن کے افسانے بناوٹ سے پاک ہیں۔ شہزاد منظر کے افسانوں کی ایک خوبی اور انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے باقی ترقی پسند مصنفین کی طرح نعرے بازی سے کام نہیں لیا اور اس کے ساتھ معاشرے میں پیدا ہونے والے مسائل اور ناانصافیوں کو مٹانے اور معاشرے کو بہتر بنانے کے لیے اپنا نقطۂ نظر قاری پر مسلط نہیں کیا بلکہ اس کا فیصلہ قاری پر چھوڑا ہے کہ وہ خود ان مسائل کے حل کے لیے اپنا نقطۂ نظر پیش کرے۔ شہزاد منظر نے افسانہ نگاری کی نسبت تنقید نگاری پر زیادہ توجہ دی ہے اس لیے ان کے تنقیدی مجموعات کی تعداد زیادہ ہے جبکہ ان کا افسانوی مجموعہ ایک ہی ہے۔ انھوں نے اپنی افسانہ نگاری کے حوالے سے خود لکھا ہے:

> "میں اظہار کی بے پناہ خواہش کے تحت افسانے لکھتا ہوں اور اس وقت تک نہیں لکھتا جب تک کسی بات یا واقعہ سے متاثر اور لکھنے پر مجبور نہ ہو جاؤں یہی وجہ ہے کہ میرے افسانے لکھنے کے درمیان بعض دفعہ بہت زیادہ وقفہ ہو جاتا ہے اور بعض افسانے میں چار چار پانچ پانچ سال کے بعد مکمل کرتا ہوں۔"(۸)

فکشن میں اُن کا کام اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں ادب میں کس قدر دلچسپی تھی اور ان کے اندر ایک تخلیق کار زندہ تھا۔ تنقید کی نسبت فکشن میں ان کا کام البتہ کم ہے مگر یہ کام اس قدر معیاری اور منفرد ہے کہ ان کا نام بطور افسانہ نگار اور ناول نگار جانا جاتا ہے۔ ان تصانیف کے علاوہ درجہ ذیل کتب اُن کا ادب سے لگاؤ ظاہر کرتی ہیں۔

مطبوعہ تصانیف:

- غلام عباس ایک مطالعہ (تنقیدی مجموعہ)
- سندھ کے نسلی مسائل

زیر طبع:

1. محمد حسن عسکری ایک مطالعہ (تنقید)
2. فحش ادب کیا ہے (تنقید)
3. اردو کے بڑے افسانہ نگار (تنقید)
4. ترقی پسند ادب کا مستقبل (تنقید)
5. جدید اردو ناول (تنقید)

شہزاد منظر نے کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی، غلام عباس اور قرۃ العین حیدر جیسے بڑے افسانہ نگاروں کے بہترین افسانوں کو یکجا کر کے بھی شائع کیا ہے تاکہ قاری کے لیے آسانی ہو۔

ہر مصنف اپنے منفرد اسلوب اور اظہار خیال سے پہچانا جاتا ہے۔ شہزاد منظر وہ شخص ہیں جنھوں نے ادب کے کئی شعبوں میں طبع آزمائی کی اور کامیاب ہوئے۔ تنقید کی تو اس موضوع پر تنقید کا آغاز کیا جس پر بہت کم کام موجود تھا، افسانے لکھے منفرد اندازِ بیان استعمال کیا۔ ناولٹ لکھا تو ایسا موضوع پیش کیا جو نہایت منفرد تھا۔ انھوں نے 1998ء میں وفات پائی اور اپنے کام سے اردو ادب میں اپنا ایک مقام بنایا۔ اس آرٹیکل میں ان کے مطبوعہ ناولٹ "اندھیری رات کا تنہا مسافر" کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

ناولٹ "اندھیری رات کا تنہا مسافر" ۱۹۸۴ء کو شائع ہوا۔ یہ دور اُردو ناول کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس عرصے میں اردو ناول اور ناولٹ کی روایت کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی گئی اور "اندھیری رات کا تنہا مسافر" جیسے کئی معیاری ناول منظر عام پر آئے۔ شہزاد منظر کا تعلق صحافت سے تھا مگر ان کی تحریر کی خوبصورتی قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ ایک صحافی ہو کر کس طرح انھیں فکشن میں بھی مہارت حاصل ہے۔ وہ اپنے انداز بیان سے پڑھنے والے کو متوجہ کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔

یہ ناولٹ انھوں نے اسپینی زبان کی نوبل انعام یافتہ شاعرہ گیبریلا مستریل کی سوانح عمری کا مطالعہ کرنے کے بعد تحریر کیا۔ وہ اُن کی زندگی سے متاثر ضرور ہوئے مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ ایک سوانحی ناول ہے۔ مصنف نے اس کا اعتراف خود بھی کیا ہے کہ ناولٹ کا براہ راست مستریل سے کوئی تعلق نہیں سوائے اس کے مرکزی کردار سے۔ بس گیبریلا کی زندگی کے کچھ پہلو شبنم کے کردار میں نظر آتے ہیں۔

انھیں لاطینی امریکی ادب میں پہلی نوبل انعام یافتہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اُن کی زندگی کا ایک خوفناک المیہ جس کے اثر سے وہ کبھی نہ نکل پائیں اُن کی پہلی محبت کی موت ہے جو کہ خودکشی تھی۔ اس حادثے کی وجہ سے ہی وہ کبھی کسی دوسرے شخص سے متاثر نہ ہوئیں اور ساری عمر تنہا گزار دی۔ یہ دکھ تمام عمر ان کے ساتھ رہا اور وہ کبھی اس سے باہر نہ آپائیں اسی وجہ سے انھوں نے شادی کیے بغیر زندگی گزاری۔ شاعرہ کی زندگی کا یہی پہلو ہے جس پر کہانی کا پلاٹ ترتیب دیا گیا۔

"اندھیری رات کا تنہا مسافر" ایک ایسا ادبی فن پارہ ہے جو اپنے موضوع کے اعتبار سے انفرادیت رکھتا ہے۔ اس کی دلچسپ بات یہ ہے کہ مصنف نے اس کی کتابی شکل میں اشاعت سے قبل اس میں تین بار بڑی تبدیلیاں کیں۔ پہلی دفعہ جب یہ قسط وار چھپا تو اس میں کلکتہ کا منظر زیادہ تھا مگر اس کے بعد دوسری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس کا پس منظر بھی تبدیل کر کے لندن کر لیا گیا۔ ۱۹۴۶ء میں پہلی دفعہ کراچی کے سالنامہ "نگارش" میں، "زندگی ایک نغمہ" کے عنوان سے شائع ہوا۔ پھر کئی تبدیلیوں کے بعد ڈھاکہ میں مشرقی پاکستان کے معروف ہفت روزہ "چترالی" اور تیسری مرتبہ کراچی سے "آہنگ" پندرہ روزہ میں شائع ہوا۔

قابلِ اعتراض چیزوں کو حذف کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جب یہ ناولٹ شائع ہوا اس سے کچھ عرصہ قبل ہی تقسیمِ بنگال کا حادثہ رونما ہوا تھا جس وجہ سے ابھی بنگلہ دیش اور پاکستان میں سفارتی تعلقات بحال نہیں ہوئے تھے۔ ایک وجہ یہ تھی کہ سرکاری طور پر جنس کی بات پر پابندی تھی۔ مشرقی معاشرے کا یہ ایک قابل اعتراض پہلو رہا ہے کہ ایسے موضوعات پر اٹھائی جانے والی آواز کو دبا دیا جاتا ہے۔ لوگ ان موضوعات پر کھل کر گفتگو نہیں کر سکتے۔ لکھاری نے ان سب حالات کی بدولت ہی اپنے فن پارے میں کئی بار تبدیلیاں کیں۔

ناولٹ مغربی شاعرہ سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے، اس لیے مصنف نے موضوع کو بیان کرنے کے لیے مغربی ماحول کا سہارا لیا ہے اور لندن کے پس منظر کو منتخب کیا ہے۔ کرداروں اور موضوع کو پیش کرنے کے لیے لندن کا پس منظر اس لیے چنا گیا کیونکہ مشرق کی نسبت مغرب میں ہی ایسا کھلا ماحول ملتا ہے جو شبنم اور انور جمیل کو ملا۔ کردار حالانکہ مشرقی ہیں مگر ناول کے موضوع کے لیے لندن کا انتخاب کرنا اس لیے ضروری تھا کہ مصنف مغربی معاشرے میں ہی شبنم اور انور جمیل کے تعلق کو دکھا سکتا تھا۔

پلاٹ، کردار نگاری، منظر کشی، جزئیات کا بیان اور سب سے اہم اس کا موضوع ہے جو انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ پس منظر کے حوالے سے اس کی اہمیت یہ ہے کہ مصنف نے بغیر لندن دیکھے، لندن کا پس منظر پیش کیا ہے۔ ان کی یہ مہارت حیران کن ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا۔ بغیر دیکھے کسی جگہ کا نقشہ ہو بہو کھینچنے کے لیے مطالعہ اور تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے۔ مصنف نے لندن کے اَن دیکھے منظر کو پیش کرنے سے پہلے ایسے ناولوں اور کتب کا مطالعہ کیا جو اس پس منظر پر موجود تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کافی تحقیق بھی کی۔ جس جگہ جانے کا اتفاق نہ ہوا ہو اس کے حوالے سے شہزاد منظر نے اپنی تنقیدی کتاب "جدید اردو افسانہ" میں لکھا ہے:

"جس جگہ یا ماحول کے بارے میں افسانہ یا ناول لکھا جائے بہتر ہے کہ مصنف خود اس مقام کا دورہ کرے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو وہ اس کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرے اور جب اسے یقین ہو جائے کہ اس نے اس مقام کے بارے میں تمام ضروری معلومات حاصل کر لی ہیں تو پھر وہ لکھنے کے لیے قلم اٹھائے"۔(۹)

اَن دیکھے ماحول کے بیان کو جس مہارت سے انھوں نے بیان کیا ہے وہ قابل تعریف ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اس حوالے سے مکمل تحقیق اور مطالعہ کر چکے ہیں، کہتے ہیں:

"انگلستان خصوصاً لندن کے بارے میں انگریزی، اردو، بنگلہ اور ہندی میں جتنی کتابیں، سفر نامے خود نوشت سوانح حیات اور یادداشتیں ملیں سب پڑھ ڈالیں۔ ہندوستان اور پاکستانی تارکینِ وطن سے ملاقاتیں کیں اور جب کافی معلومات حاصل ہو گئیں۔ تو میں نے ناول لکھنا شروع کیا۔"(۱۰)

فن پارے کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ یہ قاری کو پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔ بہت کم تخلیقات میں یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ قاری اس کو مسلسل پڑھتا جائے۔ افسانے تو ایک ہی نشست میں پڑھے جاتے ہیں کیونکہ وہ مختصر ہوتے ہیں مگر اس کے برعکس ناول مکمل کرنے کے لیے متعدد نشستیں درکار ہوتی ہیں۔ لیکن مصنف نے اپنے انداز بیان اور کہانی کے پلاٹ کی ترتیب سے اس کو اس قابل بنایا ہے کہ قاری اس کو بغیر وقفے کے پڑھ لیتا ہے۔

کہانی میں موجود تجسس جو آخر تک جاری رہتا ہے اور جس تسلسل سے واقعات پیش کیے گئے وہ قاری کو کہانی روانی سے پڑھنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ناولٹ میں کلائمکس اس کے اختتام پر آتا ہے جس وجہ سے خود بخود کہانی پڑھی جاتی ہے۔ اس حوالے سے محمد خالد اختر لکھتے ہیں:

> "یہ ناول قاری کو جبراً پڑھوا تا ہے۔ مصنف نے کہیں بھی اس کی بنت میں جھوٹ موٹ کی صناعی اور رنگ آمیزی سے کام نہیں لیا۔ کہانی نہایت سادگی خوبصورتی اور مہارت سے جوڑی گئی ہے۔"(۱۱)

منفرد موضوع کے بیان کے لیے مصنف نے ایک واقعہ کا سہارہ لیا ہے، اسی واقعہ کے بیان کے لیے پوری کہانی ترتیب دی۔ مصنف لکھنے کے فن سے خوب آشنا تھے اسی وجہ سے اس نے کہانی میں واقعات کو ایک تسلسل سے پیش کیا ہے کہ قاری کہانی میں مگن ہو جاتا ہے اسے اپنے ارد گرد کی خبر نہیں رہتی۔ وہ شبنم اور جمیل کے ساتھ خود کو ان کے ارد گرد پاتا ہے۔ اس موضوع کو انھوں نے اپنے اندازِ بیان اور کہانی کے مربوط پلاٹ سے منفرد بنایا ہے۔ قاری کہانی سے اسی وقت باہر نکلتا ہے جب ناولٹ کے اختتام پر اسے انور جمیل کی موت کی صورت میں جھٹکا لگتا ہے۔ ابو سعادت علی "اندھیری رات کا تنہا مسافر" کی کامیابی پر بات کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "ناول اپنے قاری کو فقط متوجہ ہی نہیں کرتا۔ منہمک اور خود میں گم کر دینے کی پوری پوری صلاحیت سے معمور ہے چنانچہ اس تصنیف کی ادبی کامیابی و بامرادی کا ضامن یہی عنصر ہے کہ یہ منظر کشی کرتے ہوئے بھرپور توجہ کے ساتھ ایک دم چھوٹی چھوٹی جزئیات حاصل کر لیتی ہے۔"(۱۲)

جزئیات کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ابتداء سے آخر تک ہر منظر کو حقیقی معنوں میں پیش کیا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ قاری خود لندن کی سیر کر رہا ہے اور شبنم اور جمیل کے ساتھ موجود ہے۔ اَن دیکھے منظر کی تصویر کھینچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں مگر شہزاد منظر نے جس طرح منظر کشی کرتے ہوئے چھوٹی چھوٹی چیز کی تفصیل پیش کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ ناولٹ سے چند مثالیں جو ان کی اس مہارت کا ثبوت ہے:

> "زمین پر دبیز قالین بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف صوفے رکھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف بالکل جدید طرز کی پلنگ پر گہرے نیلے رنگ کی چادر بچھی ہوئی تھی اور کمرے کی کھڑکیوں اور دروازے پر بھی نیلے رنگ کا پینٹ کیا ہوا تھا۔"(۱۳)

> "میز پر کتابیں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں اور ایش ٹرے آدھ جلے سگریٹ کے ٹوٹے سے پُر تھا۔ صوفے پر انور کی پیٹ شرٹ اور ٹائی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے رات کو جس گلاس میں دودھ پیا تھا وہ میز پر رکھا ہوا تھا۔"(۱۴)

مصنف نے اپنے کردار حقیقی زندگی سے بہت قریب دکھائے ہیں جن کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمارے ارد گرد موجود ہیں۔ اگر کردار بناوٹی ہوں تو قاری کو اُن سے ہمدردی اور لگاؤ نہیں ہوتا۔ مصنف نے مرکزی کرداروں کے ساتھ ساتھ ضمنی کرداروں کو بھی ایسے ہی پیش کیا ہے کہ وہ حقیقی کردار معلوم ہوتے ہیں۔ خندکار کا کردار ضمنی کرداروں میں سے ایک کردار ہے جو صرف ناولٹ کے آغاز میں ایک مختصر حصے میں موجود ہے۔ لیکن اس کردار میں ایک جھول ہے کہ مصنف نے اُسے اٹھائیس انتیس سال کا نوجوان دکھایا ہے جسے لندن آئے کافی عرصہ ہو چکا ہے اور اب تک چار شادیاں کر چکا ہے۔ پاکستان میں اُس کی پہلی بیوی موجود ہے اور اس کے ایک بیٹے کی شادی ہو چکی ہے اور دوسرے کی ہونے والی ہے، یہ بات درست ہے کہ مشرقی روایات کے مطابق اس کی جلد شادی ہو گئی مگر اُس کے اٹھائیس انتیس سال کی عمر میں دونوں بیٹوں کی بھی شادی ہو رہی ہے یہ بات کردار میں تھوڑا جھول دکھاتی ہے اگر خندکار کو اڑتیس، انتالیس برس کا دکھایا جاتا تو یہ بات قاری کو سوچ میں نہ ڈالتی۔ اس کے علاوہ باقی ناولٹ شبنم اور جمیل کے کردار کے گرد گھومتا ہے وہ کردار مصنف نے نہایت مہارت سے پیش کیے ہیں۔ اُن میں کسی قسم کا کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ وہ حقیقی زندگی سے قریب ترین نظر آتے ہیں۔

انسانی زندگی میں بعض دفعہ ایسا موڑ آتا ہے کہ انسان بالکل بے بس ہو جاتا ہے، اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے کس سے مدد مانگے۔ ایسا ہی شبنم اور جمیل کے ساتھ ہوا ان کی زندگی میں ایسا موڑ آیا کہ وہ دونوں خاص طور پر شبنم بے بس ہو چکی تھی کہ وہ کیا کرے۔ دونوں کردار اپنی اپنی زندگی میں خوفناک حادثات کا شکار ہوئے اور اسی حادثے کو بیان کرنے کے لیے اور اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کے رویوں پر نظر ڈالنے کے لیے کہانی ترتیب دی گئی۔

کہانی کا بنیادی Factor شبنم کا اپنے مرحوم شوہر سے مماثل شخص سے ملنا ہے۔ شکل کے ساتھ ساتھ وہ دونوں ہم نام بھی تھے۔ زندگی میں کچھ اتفاقات ایسے ہوتے ہیں جو قابل یقین نہیں ہوتے، شبنم اور انور جمیل کی زندگی میں یہ اتفاق ایسا ہی تھا جس پر دونوں حیران تھے۔ شبنم تقریباً اکیس برس پہلے اپنے مرحوم شوہر جمیل کے ساتھ لندن آئی تھی اس کی موت کے بعد وہ دوبارہ اپنے وطن واپس نہ گئی اور ہمیشہ کے لیے لندن میں جمیل کی یاد کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے شوہر سے یہ اس کی محبت اور وفاداری کا ثبوت ہے کہ اُس کی موت کے اتنے سالوں بعد بھی وہ اکیلی اس کی یادوں کے سہارے زندگی گزار رہی تھی۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان عورت تھی جس کی طرف کوئی بھی مرد با آسانی متوجہ ہو سکتا تھا اور اس کے شوہر کے بعد کئی مردوں نے اس کی زندگی میں شامل ہونے کی کوشش کی مگر شبنم نے ان کو رد کر دیا۔ شبنم کے اندر چھپی مشرقی عورت نے اُسے یہ کرنے سے روکے رکھا۔ بظاہر وہ لندن آکر کتنی ہی آزاد خیال ہو گئی ہو مگر اس کی مشرقی روایات اس میں ابھی بھی زندہ تھیں۔

شبنم کی زندگی کی کہانی، اسکا ماضی مصنف نے فلیش بیک کی تکنیک کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اس کے خاندان کا تعارف، پہلے شوہر سے ملنا، ان کی شادی، لندن آنا، ادھر آکر رہنا اور پھر دوسری جنگ عظیم میں جمیل کی حادثاتی موت

سب کچھ اس کی زبانی پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے فلیش بیک کے ساتھ ساتھ انور جمیل اور شبنم کی حالیہ ملاقات کو بھی پیش کیا ہے۔ چونکہ وہ اپنی کہانی خود انور جمیل کو بتاتی ہے اس لیے دونوں ہی منظر پر موجود رہتے ہیں۔ اس میں لندن اور کلکتہ کا منظر بھی ساتھ ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ شبنم کا ماضی اس کی زبانی پیش کرنے کی وجہ ناولٹ کی طوالت کو کم کرنا ہے اگر یہ کام مصنف خود کرتا تو واقعات کے بیان کے لیے وہ کوئی اور طریقہ اپناتا اور ناولٹ طویل ہو جاتا۔ مصنف نے نہایت مہارت سے ناولٹ کے اختصار کو بر قرار رکھنے کے لیے یہ کام اپنے کردار سے کروایا ہے۔

شبنم جو اپنی محبت اور وفاداری کی وجہ سے اپنے شوہر کی یاد کو اپنے ساتھ لگائے تنہا زندگی بسر کر رہی تھی۔ وہی شبنم جو پہلے کسی سے اتنی جلدی متاثر نہ ہوتی اور نہ ہی اس طرح گھل مل جاتی وہ انور سے پہلی ہی ملاقات میں اس قدر متاثر ہوئی کہ اس نے اپنی زندگی کا ہر راز اُس کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے متاثر ہوئے تھے اور ایک دوسرے سے نہایت قریب ہو گئے۔ ان میں اتنی دوستی ہو گئی کہ شبنم نے پہلی ہی ملاقات میں اسے اپنے گھر کھانے پر بلالیا۔ لندن کا پس منظر چننے کا مقصد بھی یہی تھا کہ کرداروں کی تصویر اصل معنوں میں پیش ہو سکے۔ لندن جیسے ماحول میں جا کر مشرقی ممالک سے تعلق رکھنے والے قدامت پرست لوگ بھی اتنے آزاد خیال ہو جاتے ہیں کہ ان کے لیے یہ باتیں معمولی ہو جاتی ہیں جو مشرق میں معیوب سمجھی جاتی ہیں۔

انور سے پہلے وہ کسی بھی مرد کی طرف تعلق نہ بڑھاتی، اپنے شوہر کی موت کا غم پوری جوانی اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ انور میں اس کو اپنی پہلی محبت نظر آئی جس وجہ سے وہ خود بخود اُس کی طرف کھینچی چلی گئی۔ انور جمیل ناولٹ کا ایک اہم کردار ہے۔ یہ کہانی انور کی زندگی کے المیے کا بیان ہے وہ المیہ جس پر اس کا کوئی بس نہیں تھا۔ انور چھ ماہ قبل لندن آیا تھا۔ وہ شبنم سے پہلی دفعہ خندر کار کے ہوٹل میں ملا مگر اس سے پہلے اس نے یوم پاکستان کی تقریب کے موقع پر شبنم کو دیکھا تھا جو تب اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن شبنم اُسے یوں ہی ملی جیسے پہلی دفعہ اُسے دیکھا ہے۔

انور جوانی کی نعمت سے محروم تھا۔ جس کا غم وہ اپنے اندر چھپائے زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ اُس کے کسی بھی عمل سے، گفتگو سے کبھی بھی محسوس نہ ہوا کہ اس کے اندر اتنا خطرناک طوفان چل رہا ہے۔ انور نے خود کو اس قدر مضبوط بنایا تھا کہ قاری کو تو کیا اُس کے قریبی لوگوں کو بھی کبھی اس بات کا احساس نہ ہوا کہ وہ کسی کمی کو اپنے اندر چھپائے ہوا ہے۔ اس کے راز کا انکشاف اس کی موت کے بعد ہوتا ہے جو شبنم اور قاری کو ایک زور دار جھٹکا دے کر حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

انور کی خودکشی ناولٹ کا سب سے اہم موڑ ہے۔ اس موڑ پر بھی قاری اور شبنم اس کی خودکشی کی وجہ کا اندازہ نہیں لگا پاتے کیونکہ ان کی سوچ اس حد تک نہیں جاتی۔ مصنف نے نہایت مہارت سے اس موضوع کو بیان کیا ہے جس کے بیان کے لیے ایک بھاری بھر کم ناول لکھنا پڑتا مگر انھوں نے دریا کو کوزے میں سمیٹنے والا کام کیا ہے۔ انور کی زندگی کا راز قاری اور شبنم پر عیاں کر کے مصنف نے کہانی کو کھلے اختتامیہ پر چھوڑ دیا ہے کہ قاری اس بات کا فیصلہ کرے کیا ایسے لوگ جو

انور کی طرح کسی نعمت سے محروم ہیں ان کا انجام انور جیسا ہونا چاہیئے؟ یا ہمیں ایسے لوگوں کے ساتھ اپنے رویے درست کرنے کی ضرورت ہے؟ انسان اس وقت تک یہ قدم نہیں اٹھاتا جب تک وہ اندر سے مکمل طرح ٹوٹ نہیں جاتا، اس کے لیے جینا مشکل ہو جاتا ہے۔ جباسے دنیا اپنے لیے تنگ لگے پھر ہی انسان یہ قدم اٹھاتا ہے۔

انور کا المیہ انسانی المیہ ہے جس کا شکار کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ معاشرے کا دباؤ اور لوگوں کے سخت رویے ایسے لوگوں کو جینے نہیں دیتے اور وہ اپنے دکھ کا اظہار نہیں کر پاتے۔ انور کی طرح بہت سے لوگ دنیا کے سامنے اپنے دکھ بیان نہیں کرتے وہ دنیا کے سامنے خود کو مضبوط ظاہر کرتے ہیں لیکن ان کے اندر ایک جنگ جاری ہوتی ہے۔ دنیا کے سامنے ہنستے کھیلتے، خوش و خرم نظر آتے ہیں، اپنے سارے کام خود کرتے ہیں۔ ان کے دکھ کی شدت تنہائی میں بڑھتی ہے ان کے دماغ میں یہ سارے مسائل دبے ہوتے ہیں۔ جسمانی طور پر وہ خوش نظر آتے ہیں مگر دماغی طور پر وہ بہت کچھ برداشت کر رہے ہوتے ہیں۔

انسانی دماغ جسم کا سب سے اہم حصہ ہے جو پورے جسم میں جو بھی معاملات ہیں ان کو کنٹرول کرتا ہے، پورے جسم کو دماغ سے ہی کمانڈ ملتی ہے۔ وہ حصہ جو پورے جسم کو چلاتا ہے اگر اسے ہی سکون نہیں ملے گا تو پورا جسم بھی بے چینی کا شکار ہو گا۔ صحت مند جسم کے لیے صحت مند دماغ ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہو گا تو جسم بھی مختلف بیماریوں کا شکار رہے گا۔ دماغ کو صحت و تندرست اور دماغی طور پر تسکین تب ہی مل سکتی ہے جب دماغ ہر قسم کے دباؤ سے آزاد ہو۔

انور جیسے لوگ جو دنیا کو خوش و خرم نظر آتے ہیں۔ اپنا سارا کام وقت پر کرتے ہیں، اپنی دوستیاں اور باقی رشتے بھی صحیح طرح نبھاتے ہیں۔ ان کے افعال سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کے اندر کوئی جنگ جاری ہے وہ اپنے دکھ کا اظہار نہیں کر پاتے، وہ لوگ Expressive نہیں ہوتے وہ High Functioning Depression کا شکار ہوتے ہیں۔

> "This term refers to anyone who is grappling with mental health issues while accomplishing their day-to-day tasks and upholding their responsibilities."(15)

یہ بیماری بچپن کے کسی حادثے، دماغ کے کیمیکلز کی بے ترتیبی، خاندانی بیماری اور زندگی کے کسی گہرے صدمے کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ جس سے انسان بے حس محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی موت، خودکشی اور اپنے آپ کو نقصان پہنچانے کا سوچتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی روزمرہ کی زندگی آرام سے گزارتا ہے۔ دنیا پر وہ اس کا انکشاف نہیں ہونے دیتا۔ کچھ لوگوں میں یہ احساس بہت کم ہوتا ہے اور بعض میں اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ انور کی طرح خودکشی کر لیتے ہیں۔

> "High Functioning depression can happen at any severity, from mild to so severe that the person is self-harming or at risk of suicide. However, they are often hiding their symptoms from other people."(16)

انور کی طرح یہ لوگ تعلیم یافتہ، اچھی نوکری پر معمور اور خوش لباس نظر آتے ہیں۔ دیکھنے والے ان کی ظاہری زندگی سے اس بات کا اندازہ ہی نہیں لگا پاتے کہ ان کے اندر ہی اندر اپنی جان لینے کی خواہش ہے۔ انور نے بھی کئی برس اپنے اس مرض کا مقابلہ کیا جو اس کی زندگی کے ایک خوفناک حادثے کی وجہ سے اس میں آیا تھا۔ مگر زندگی کے ایک موڑ پر جب اسے لگا کہ وہ دنیا کے سامنے اپنا راز کھول دے گا اور وہ لوگوں کی باتوں کا سامنا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے ڈالی۔

بعض حادثے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں انسانی جان تو بچ جاتی ہے مگر وہ حادثے انسان سے وہ نعمت لے جاتے ہیں کہ انسان یہ خواہش کرتا ہے کہ اُس کی جان ہی چلی جاتی تا کہ اُسے یوں بے بسی سے زندگی نہ گزارنی پڑتی۔ انور کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ بھی حادثاتی طور پر ہوا مگر اس نے اس محرومی سے، آزاد ہونے کی بھرپور کوشش کی۔ جوانی کی مسرتوں سے محروم ہونا ایک جوان کے لیے بہت کٹھن مرحلہ ہے انور نے اپنی اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے کبھی ہمت نہ ہاری اور اسکا ہر ممکن علاج کروانے کی کوشش میں لگا رہا۔ جب اسکا علاج ممکن نہ ہوا تو اس نے خود کو زندگی کے دھارے پر چھوڑ دیا کہ جس طرف اسے زندگی لے جائے گی وہ اپنا رخ اس طرف موڑ لے گا۔ وہ اپنے غم کو اپنے اندر دبا کر زندگی میں آگے بڑھنے کی کوشش میں لگ گیا۔ اس نے اپنے دکھ کو بھلانے کے لیے اپنی توجہ کتابوں کی طرف کر دی۔ جب انسان زندگی میں ہر طرح سے مایوس اور بے بس ہو جاتا ہے تو وہ کتابوں کو اپنا دوست بنالیتا ہے انور نے بھی ایسا ہی کیا۔

انور کی طرح معاشرے میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو کسی نہ کسی نعمت سے محروم ہیں اور اپنے آپ سے جنگ کر رہے ہیں۔ مصنف نے انور کے ذریعے ان تمام لوگوں کی طرف توجہ دلانا چاہی ہے۔ وہ اپنی ذات سے لڑتے ہیں مگر کسی سے اپنے غموں کا اظہار نہیں کرتے اور ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس ذہنی دباؤ سے انسان تب ہی آزاد ہو سکتا ہے جب وہ اپنے ان دکھوں کا اظہار کرے جو اُس نے اپنے اندر جمع کیے ہوئے ہیں۔ انسان کے دل کا بوجھ کتھارسس یعنی تزکیہ نفس سے کم ہوتا ہے اسی طرح دماغ تب ہی سکون محسوس کرے گا جب وہ بوجھ سے آزاد ہو گا۔ اور وہ بوجھ تب ہی ختم ہو سکتا ہے جب انسان بات چیت کرے۔ دماغی بیماریوں کے علاج میں دوائیوں کے ساتھ تھراپی بھی ضروری ہے۔ تھراپی کے ذریعے انسان اپنے اندر چلنے والے معاملات کا اظہار کرتا ہے جس سے اس کو ذہنی سکون ملتا ہے۔

عالم شباب کی نعمت ازدواجی زندگی میں نہایت اہم ہے اس کے بغیر یہ رشتہ نامکمل سمجھا جاتا ہے۔ یہ جذبہ اس قدر شدید اور زور آور ہے کہ انسان چاہ کر بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ جیسے انسانی زندگی میں باقی خواہشات اہم ہیں ویسے ہی اس جذبے کی اہمیت ہے جو انسان کے پیدا ہونے سے لیکر موت تک اُس کے ساتھ رہتا ہے۔ یہ آرزو بھی باقی آرزوؤں کی طرح انسانی جذبات کا ایک فطری حصہ ہے۔ انسانوں کے ساتھ باقی جاندار مخلوقات میں بھی اس کی اہمیت واضح ہے۔ جانداروں کی آفزائش اور نسل بڑھانے کے لیے یہ اس زمین پر موجود ہر جاندار کے لیے ایک اہم پہلو ہے۔ انسانی

ضرورت کے ساتھ یہ جذبہ انسانی خواہش بھی ہے۔ یہ جذبہ اگر ایک حد تک رہے اس کا نقصان نہیں لیکن جو لوگ اسے اپنے اوپر حاوی کر لیتے ہیں یہ جذبہ انھیں وحشی بنا دیتا ہے انسان اپنے ہوش و ہواس کھو بیٹھتا ہے۔

فنون لطیفہ کے ہر شعبے میں اس موضوع کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ مصوری، موسیقی، رقص خصوصاً ادب انسانی جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ ان تمام فنون لطیفہ میں جنس پر کھل کر بات کی گئی ہے۔ ادب میں سب پہلے " نظریہ جنس" فرائیڈ نے پیش کیا۔ فرائیڈ سے پہلے بہت سے مصنفین، ماہر بشریات اور ماہر نفسیات نے جنس کے موضوع پر اپنے نقطہ کا اظہار کیا تھا مگر فرائیڈ نے اسے وسیع مفہوم میں پیش کیا اور اسے نفسیاتی نقطہ نظر کے حوالے سے بیان کیا۔ فرائیڈ نے اسے باقی ماہرین کی طرح فحاشی پہلو کے حوالے سے بیان کرنے کی بجائے انسانی نفسیات پر اس کے اثرات کو بیان کیا ہے۔

"اندھیری رات کا تنہا مسافر" بھی جنسی حوالے سے اہم ہے۔ مصنف نے یہ بات یقینی بنائی ہے کہ کہانی میں کسی قسم کے فحش الفاظ نہ استعمال کیے جائیں۔ اور نہ ہی گناہ رنگین کے بے جا تذکروں سے اسے آلودہ کیا ہے۔ اس حوالے سے ابو سعادت جلیلی رقم طراز ہیں:

"یہ بات بڑی خاص ہے کہ ناول نگار نے رنگینی بیان کو نہ تو گناہ رنگیں کے جا بے جا تذکروں سے آلودہ کیا ہے اور نہ ہی جنسی اختلاط و اتصال کے مناظر کو حکایت لذیذ کے طور پر ایکسپلائٹ کیا ہے۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ مصنف کا قلم جنسی اختلاط و اتصال سے ملوث ہوئے بغیر ہی قاری کو اپنی مؤثر گرفت میں لے لیتا ہے"۔(۱۷)

انور کا عالم شباب کی نعمت سے محروم ہونا اس کی خودکشی کی وجہ بنا۔ اس کی خودکشی اس معاشرے کے لیے ایک سوالیہ نشان ہے کہ کس طرح معاشرہ ان لوگوں کے لیے تنگ ہو جاتا ہے کہ وہ ایسا قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائیں۔ انور نے تمام عمر اپنے اس راز کو دنیا سے چھپا کر رکھا لیکن جس مقام پر اسے محسوس ہوا کہ اب اس کا یہ بھید کھل کر سب کے سامنے آجائے گا خاص طور پر اس انسان کے سامنے جسے وہ شدید چاہتا ہے اور شبنم سے دور ہونے کے خوف سے کہ نا جانے وہ اُس کو اس کمی کے ساتھ قبول کرتی ہے کہ نہیں اس نے خود اپنی جان لے لی۔ مصنف نے انور کے ذریعے یہ سوال اٹھایا ہے کہ معاشرے میں اور کتنے انور اسی طرح اپنی جان لیں گے ؟

انسانی جان بہت قیمتی ہے ہر انسان کو اپنی جان پیاری ہے۔ زندہ رہنے کے لیے انسان بہت تگ و دو کرتا ہے پھر کیوں وہ اپنی جان خود اپنے ہاتھوں سے لیتا ہے؟ کیوں انسان اتنا بڑا قدم اٹھاتا ہے؟ اس کو کیا چیز اتنا مجبور کر دیتی ہے کہ وہ خود کو نقصان پہنچا لیتا ہے؟ اس کی سب سے بڑی وجہ "لوگ کیا کہیں گے" ہے۔ ان لوگوں کی باتوں اور تلخ رویوں کی وجہ سے ہی کوئی اتنا بڑا قدم اٹھاتا ہے۔ ان لوگوں میں کون شامل ہے؟ ان میں ہم سب شامل ہیں اگر ہم اپنے رویے اور اپنی سوچ بدل لیں تو بہت سے انور زندہ ہوں۔

شبنم سے ملنے سے قبل وہ اس حادثے کا شکار ہوا اور اس نعمت سے محروم ہو گیا۔ شبنم سے پہلے وہ جس لڑکی سے محبت کرتا تھا اس کی زندگی خراب نہ ہو اس لیے اُسے چھوڑ دیا اور کبھی کسی دوسری لڑکی کی طرف اسکا دھیان نہ گیا۔ لیکن شبنم سے ملنے کے بعد وہ اس کا دیوانہ ہوتا چلا گیا کہ وہ اپنی اس محرومی کو بھی بھول گیا۔ انور نے اپنی اس کمی کو ظاہر نہ ہونے دیا، وہ بظاہر خوش رہتا ہے، اس نے اپنی اس کمی کو اپنے تک محدود کر رکھا ہے پھر اس نے اتنا بڑا قدم کیوں اٹھایا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ شبنم کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا تھا۔ وہ شبنم سے بے پناہ محبت کرتا تھا اس کی نظروں میں خود کو نہ گرانے کے لیے اس نے یہ قدم اٹھایا۔ انسان دنیا میں ہر انسان کی نظروں میں گرنا برداشت کرلیتا ہے مگر اپنے محبوب کے آگے وہ ایک مکمل شخص کے طور پر ہی پیش ہونا چاہتا ہے۔

انور کی موت کی بڑی وجہ اس مسئلے کے بارے میں بات نہ کرنا ہے۔ اگر وہ اور شبنم ایک دوسرے سے سچی اور پر خلوص محبت کرتے تھے تو دونوں کو اس معاملے پر بات کرنی چاہیئے تھی۔ بات چیت سے مسائل کا حل نکلتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اگر انور شبنم سے بات کرتا تو نتائج کچھ اور ہوتے۔ شبنم اس بات کو سمجھتی اور اس مسئلے کا حل نکل آتا۔ لیکن انور نے اس پر بات کرنے کے بجائے خود سے سب کچھ سوچ کر فیصلہ کیا اور اتنا سخت قدم اٹھالیا جو اس کے ساتھ ساتھ شبنم کے لیے بھی ایک کڑا امتحان بن گیا۔

شبنم نے اپنی زندگی تنہائی میں گزار دی۔ اپنے شوہر کے بعد انور واحد مرد تھا جس سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے اگر کسی مرد نے اس کے ساتھ کوئی جنسی تعلق قائم کرنے کی کوشش بھی کی تو اس نے اُسے اپنی زندگی سے باہر نکال پھینکا۔ انسان کو زندگی میں بعض دفعہ بس کسی کا ساتھ اور ہمدردی و پیار کافی ہوتا ہے کہ وہ اس کے سہارے زندگی گزار لے۔ انور اور شبنم جس موڑ پر تھے ان کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ کافی تھا۔ مگر انور نے شبنم سے تمام معاملات چھپا کر اپنی جان لے لی انور سے پہلے شبنم کے ساتھ اگر کسی نے ایسے تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی تو وہ ہمیشہ سوچتی:

> "کیا دنیا میں مرد اور عورت کے درمیان جنسی محبت کے علاوہ اور کسی قسم کا رشتہ قائم نہیں ہو سکتا؟ کیا جنس ہی سب کچھ ہے؟ پر خلوص دوستی اور انسانی ہمدردی کوئی چیز نہیں؟ یہ صحیح ہے کہ مرد و عورت کے درمیان جنسی تعلقات ضروری ہیں لیکن یہ تعلقات ہی سب کچھ ہیں؟ اس سے علیحدہ کوئی قدر اور جذبہ قابل ستائش نہیں؟ کیا آج کا انسان اس سے الگ ہو کر کچھ نہیں سوچ سکتا؟(۱۸)

شبنم کی سوچ سے بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کے لیے جنسی تعلقات کے علاوہ باقی جذبات بھی قابل احترام اور اہم ہیں۔ وہ مرد اور عورت کے اس تعلق کے علاوہ باقی تعلقات جو دوستی اور ہمدردی کے ہوتے ہیں ان کا احترام کرتی ہے۔ اس

کے لیے باقی جذبات بھی قابل قدر ہیں تو اس سے واضح ہے کہ انور جس سے وہ محبت کرتی ہے اپنے شوہر کے مرنے کے اتنے سال بعد پہلی مرتبہ اس نے کسی کو ٹوٹ کر چاہا ہے تو وہ یقینی طور پر انور کی کمی کو قبول کر کے اس سے اپنا تعلق قائم کرتی۔

ان کا تعلق محبت کا تعلق تھا جو دنیا میں تمام رشتوں سے خوبصورت رشتہ ہے۔ جب انسان کسی سے محبت کرتا ہے تو وہ اپنے ساتھی کو اس کی تمام اچھی بری عادتوں، تمام کمیوں کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ محبت کا تقاضہ ہے کہ اپنے ساتھی کو بغیر شرائط اور کسی غرض کے چاہا جائے۔ اگر اس میں کوئی کمی ہے تو اس کو نیچا دیکھانے کی بجائے اس کا ساتھ دینا ہی محبت ہے۔

شبنم میں انور سے ملنے کے بعد نمایاں تبدیلیاں رونما ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ انور کو بے پناہ چاہتی تھی۔ اسی لیے وہ انور سے ملنے کی خاطر کوشش کرتی اگر کبھی ان کی ملاقات نہ ہوتی تو وہ بے چین رہتی۔ یہ انور کے لیے اس کے جذبات ہی تھے کہ اس کے آنے کے بعد اس کے اندر کی سوئی ہوئی عورت جاگ اٹھی۔ انور سے پہلے اس نے خود کو کام میں مصروف کرر کھا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں جمیل کی موت کا غم مٹانے کے لیے دن رات کام میں مصروف رہتی۔ لیکن اب اسے کام ختم کرنے کی جلدی ہوتی۔ مصنف نے شبنم کے کردار کی یہ تبدیلی اس طرح بیان کی ہے:

> "انور کی پرکشش شخصیت نے اس پر جادوئی اثر کیا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے جمیل ایک بار پھر اس کے سامنے آ گیا۔ اس نے جب سے انور کو دیکھا تھا اس کے اندر کی برسوں سوئی ہوئی عورت ایک بار پھر جاگ اٹھی تھی۔(۱۹)

جمیل کے جانے کے بعد اُس کی زندگی تاریک ہوگئی تھی۔ زندگی کی رونقیں اُس کے لیے تمام ہو گئیں تھیں۔ انور کے ساتھ نے اس کی زندگی کو دوبارہ رنگین بنایا تھا وہ اب انور سے ملنے کے لیے تڑپتی تھی۔ اس کے اندر کی عورت اسطرح سے بھی جاگی تھی کہ اس نے انور کے لیے خود کو مزید سوارنا شروع کر دیا تھا کہ اسے جمیل کا غم بھول چکا تھا۔ وہ انور میں جمیل کو پا کر بہت خوش تھی اور اس خوشی کا اظہار اس میں آنے والی تبدیلیوں سے ہوتا تھا۔ انور کے بعد شبنم کی زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کو مصنف نے یوں دکھایا ہے:

> "شبنم میں اب نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں تھی۔ وہ اب خوش و خرم رہنے لگی تھی۔ وہ انور کے قریب رہ کر بڑی خوشی محسوس کرتی اور اس کے ساتھ سیر و تفریح کر کے بہت خوش ہوتی۔ اس کی جب سے انور سے ملاقات ہوئی تھی وہ جمیل کو آہستہ آہستہ بھولتی جا رہی تھی۔ جمیل ایک نئے قالب میں اس کے سامنے آ گیا تھا اور وہ جمیل کو انور کی صورت میں پانے کی کوشش کر رہی تھی۔"(۲۰)

شبنم جس طرح سے انور کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کی کوشش کر رہی تھی یہ اُس کی زندگی میں محبت کی کمی تھی ۔اس نے اپنی جوانی تنہا گزار دی وہ اب اسی خلل کو پُر کرنے کی کوشش میں تھی۔ اگر اس کی محبت جنسی محبت سے بڑھ کر ہوتی، پیار کے جذبے سے سرشار ہوتی وہ ضرور انور کو اس کی کمی کے ساتھ قبول کرتی۔ انور کا شبنم سے اور اس کے علاوہ اور کسی سے بھی اس بارے میں بات نہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ مشرقی لوگ ایسے معاملات کے حوالے سے کھل کر بات نہیں کرتے۔ وہ ان معاملوں میں بات کرنے سے ہچکچاتے ہیں حالانکہ یہ انسانی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے۔ ازدواجی زندگی میں اس حوالے سے کھل کر بات کرنا ضروری ہے. اگر آپ کسی کے ساتھ ساری زندگی گزارنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس سے ہر معاملے میں کھل کر بات کرنا ضروری ہے۔ مگر ہمارے ہاں ان معاملات پر بات کرنے سے روک دیا جاتا ہے اور جو لوگ ان پر بات کریں تو انھیں بے شرم اور بے حیا کے لقب سے نواز دیا جاتا ہے۔ جبکہ مغربی لوگ ان مسائل سے کم دوچار ہیں کیوں کہ وہ ان معاملات پر بات کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ اگر ہم اپنے مذہب کی بات بھی کریں تو اللہ نے قرآن میں ہر چیز کو کھول کر بیان کیا ہے تو پھر ہم لوگ کیوں ان پر بات نہیں کر سکتے ہماری اس شرم اور ہچکچاٹ سے کئی قیمتی جانیں چلی جاتی ہی۔ انور کا لندن جا کر آزاد خیال ہو جانا مگر اس لحاظ سے وہ ابھی بھی ایک قدامت پسند مشرقی انسان ہے جو ایسے موضوعات پر بات کرنے سے گھبراتا ہے۔

ناولٹ اس حوالے سے بھی منفرد ہے کہ مصنف نے ایک مرد کے مسئلے کو اجاگر کیا ہے۔ ادب میں اس سے پہلے اور آج تک عورتوں کے مسائل اور حقوق کے حوالے سے کافی کام موجود ہے مگر یہ شہزاد منظر کی مرد ذات کے مسائل کو معاشرے میں اُجاگر کرنے کی پہلی پیش رفت ہے۔ ادب کے علاوہ بھی اگر دیکھا جائے تو معاشرے میں مردوں کے لیے ایسے اقدامات نہیں کیے جاتے جو عورتوں کے لیے کیے گئے ہیں۔ عورتوں کے حقوق کے لیے عورت مارچ نکالا جاتا ہے، مختلف تنظیمیں اس حوالے سے کام کر رہی ہیں۔ مغرب کے علاوہ اب پاکستان میں اس کا رجحان ہے۔ پاکستان میں متعدد تنظیمیں عورتوں کے حقوق کے لیے کام کر رہی ہیں۔ پہلا عورت مارچ پاکستان میں 8 مارچ 2018ء کو نکالا گیا جس میں مردوں کی بڑی تعداد نے بھی شرکت کی 2018ء سے آج تک ہر سال عورت مارچ نکالا جاتا ہے۔ خواتین کا عالمی دن بھی اسی روز پوری دنیا میں منایا جاتا ہے۔ ہر کوئی خواتین کے عالمی دن پر خواتین کے حقوق کے تحفظ کی بات کرتا ہے اس کے برعکس مردوں کے عالمی دن کا بہت کم لوگوں کو علم ہے۔ جو کہ 19 نومبر کو آتا ہے مگر مردوں کے لیے اُن کے عالمی دن پر بھی کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ ویسے تو ہر معاملے میں مردوں کو برتری حاصل ہے مگر اس حوالے میں وہ عورتوں سے پیچھے ہیں۔

مرد کو معاشرے کا مضبوط فرد سمجھا جاتا ہے اسے پوٹرے ہی ایسے کیا جاتا ہے کہ وہ کوئی بھی دکھ عورتوں کے مقابلے میں حوصلے اور ہمت سے برداشت کر لیتے ہیں۔ مردوں کو بھی اپنا یہ پوٹرے بہت پسند ہے وہ خود بھی اپنے مسائل دوسروں کے سامنے پیش کرنے میں اپنی ذات کی توہین سمجھتا ہیں۔ ٹھیک ہے مرد عورت کے مقابلے میں مضبوط ہے، خدا نے مرد کو ہمت والا اور عورت سے مضبوط ہی پیدا کیا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ مردوں کے کوئی جذبات نہیں ہوتے یا ان کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ عورت کی طرح مرد بھی احساسات و جذبات رکھتا ہے زندگی کے کئی معاملات میں اسے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی زندگی میں بھی کئی دفعہ ایسے موڑ آتے ہیں جب انھیں کسی کی ہمدردی کی طلب ہوتی ہے ان کا بھی حق ہے کہ معاشرے میں ان کے مسائل پر بھی بات کی جا سکے تاکہ ان کے مسائل جو انھیں اندر سے دیمک کی طرح کھا رہے ہوتے ہیں وہ کھل کر سامنے آسکیں۔

انور اور شبنم دونوں کے کرداروں میں ایک بات مشترک ہے کہ وہ اپنی زندگی میں خوفناک حادثات کا شکار ہوئے ہیں لیکن دونوں نے ہی اُن سے نکلنے کی کوشش کی ہے اور دنیا کے سامنے خود کو مضبوط دیکھایا ہے۔ بظاہر دونوں ہی بن سنور کر زندگی گزار رہے تھے مگر اندر سے دونوں ہی کھوکھلے تھے۔ اپنے غموں پر پردہ ڈالے زندگی گزارنے میں مصروف تھے۔ کہانی کا میلوڈرامائی انداز میں اختتام ہی کہانی کی کامیابی ہے۔ کسی بھی پہلو پر قاری کو احساس نہیں ہوتا کہ کہانی کا رخ اس طرف جانے والا ہے۔ شبنم کی زندگی میں وہی حادثہ دوبارہ رونما ہوتا ہے جو کئی برس پہلے ہوا تھا۔ اس کے محبوب کی موت قاری کو ایک زوردار دھچکا دیتی ہے۔ بعض اچھی کہانیاں بس اپنے ایسے میلوڈرامائی انداز کی وجہ سے اپنا تاثر کھو دیتی ہیں لیکن اس کہانی کی کامیابی کی وجہ یہی ہے۔

ناولٹ کا شمار عشق اور المیے کے بہترین فن پاروں میں ہوتا ہے۔ اس سے معاشرے کے ایک سنگین مسئلے کو اجاگر کیا ہے۔ کرداروں کی بنت بہت خوبصورتی سے کی گئی ہے کہ وہ اس معاشرے کے چلتے پھرتے عام لوگ نظر آتے ہیں۔ قاری کو کردار سے اسی وقت ہمدردی اور لگاؤ ہوتا ہے جب کردار اسے اپنے جیسے عام انسان لگتے ہیں۔ ناولٹ کی اہم خوبی یہ بھی ہے کہ تخلیق کار نے اسے افسانے کی طرح کھلا اختیامیہ چھوڑا ہے جس کی بڑی وجہ ہے کہ قاری خود اس بات کا فیصلہ کرے کہ کون سا کردار زیادہ ہمدردی کے لائق ہے۔

پوری کہانی میں آغاز سے آخر تک ساری ہمدردیاں شبنم سمیٹ رہی تھی مگر انور کی بے یقینی موت نے قاری کو حیران کر دیا۔ انور کی موت اور اس کی زندگی کے خوفناک المیے کی بدولت قاری کی تمام تر توجہ اور ہمدردی انور کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔ مگر دونوں کردار ہی برابر کی ہمدردی کے مستحق ہیں۔ ان کے ساتھ زندگی نے نہایت خوفناک کھیل کھیلے ہیں ایک کی موت ہوتی ہے تو دوسرے کو بھی اس کی موت کی صورت میں تنہائی کا غم ملتا ہے۔ شبنم سے ایک دفعہ پھر اس کی محبت چھن جاتی ہے اور وہ پھر سے اس دنیا میں تنہا رہ جاتی ہے۔ دونوں کی محبت ادھوری رہ جاتی ہے۔

موضوع سے لیکر کرداروں کی تصویر کشی، ماحول کا بیان، واقعات کا ایک تسلسل میں پیش کرنا اس فن پارے کو منفرد اور میعاری بناتا ہے۔ تخلیق کار ایک صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ لکھنے کے فن سے بھی باخوبی واقف ہے اسی لیے اس نے ہر پہلو کو نہایت دلکشی سے بیان کیا ہے۔ اردو ادب میں اسکا شمار میعاری ناولوں میں ہوتا ہے۔ بقول قیوم راہی:

"شہزاد منظر نے ماحول کی عکاسی دلکش انداز میں کی ہے۔ واقعات کے تسلسل میں بھی سلیقہ ہے۔ کردار نگاری میں حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ان تمام خوبیوں نے ناولٹ کو بعقول محمد خالد اختر ایک ورک آف آرٹ بنادیا ہے"(۲۱)

خلاصہ بحث:

ناولٹ نگاری ایک نثری صنف ہے جو ناول سے ماخوذ ہے۔ ناولٹ میں مصنف کسی مخصوص عہد کی عکاسی کرتا جس کا مقصد محض ذہنی تسکین نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ہے۔ مصنف اپنے ناولٹ میں دریا کو کوزے میں سمیٹنے کا کام کرتا ہے۔ اس ارٹیکل میں ناول اور ناولٹ کا مختصر تعارف بیان کرتے ہوئے شہزاد منظر کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اردو ادب میں ان کے دیگر کام پر بھی بات کی گئی ہے۔ شہزاد منظر کا شمار نامور صحافیوں میں ہوتا ہے مگر انھوں نے صحافت کے ساتھ ساتھ دیگر اصناف ادب میں بھی طبع آزمائی کی۔ شہزاد منظر نے اگر افسانے لکھے تو ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جو منفرد حثیت رکھتے تھے۔ تنقیدی کام کا آغاز کیا تو وہ موضوعات لیے جن پر پہلے کبھی کسی نے کوئی کام نہیں کیا تھا۔ شہزاد منظر نے ادب میں جو بھی کام کیے وہ انفرادی حثیت رکھتے ہیں۔ ان کا ناولٹ "اندھیری رات کا تنہا مسافر" اسی انفرادیت کا ثبوت ہے۔ اس آرٹیکل میں ناولٹ "اندھیری رات کا تنہا مسافر" پر تنقید کرتے ہوئے معاشرے کے خوفناک پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس ناولٹ میں انھوں نے ایک منفرد پہلو کو اجاگر کیا جس پر پہلے کسی نے بات نہیں کی۔ ناولٹ کی کہانی شبنم اور انور جمیل کے گرد گھومتی ہے۔ جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہے۔ شبنم اپنے پہلے شوہر کی موت کے بعد کسی مرد کی طرف متوجہ نہیں ہوئی اور اپنی جوانی لندن جیسے شہر میں تنہا گزار دی۔ انور سے ملنے کے بعد وہ اس قدر متاثر ہوئی کہ اس کی محبت میں گرفتار ہوتی چلی گئی۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انور جمیل کا نام اور شکل شبنم کے مرحوم شوہر سے ملتی تھی۔ یہ ناولٹ کا بنیادی پہلو ہے اسی وجہ سے شبنم اپنی زندگی میں دوبارہ کسی مرد کو جگہ دیتی ہے۔ انور جمیل کی زندگی کا خوفناک المیہ یہ ہے کہ وہ عالم شباب کی نعمت سے محروم ہے۔ لیکن اس دکھ کا اظہار اپنی زندگی میں کبھی کسی سے نہ کرسکا۔ آپس میں شدید محبت ہونے کے باوجود بھی وہ اس معاملے پر شبنم سے بات نہ کرسکا۔ اور اس کمی کی وجہ سے اس نے اپنی جان لے لی۔ انور کا یہ راز ناولٹ کے اختتام پر پیش کیا گیا جس نے شبنم کے ساتھ ساتھ قاری کو بھی زوردار جھٹکا دیا۔ اس معاملے پر بات نہ کرنے کی وجہ سے انور جمیل کی جان جانے کے ساتھ شبنم پھر سے اپنی محبت

سے محروم ہو گئی۔ ناولٹ کی اہم بات یہ ہے کہ قاری کو کسی پہلو پر اس میلو ڈرامائی اختتام کا انداز نہیں ہو تا۔ کہانی اس میلو ڈرامائی انداز کی وجہ سے ہی کامیاب ہے۔ انور کی بیماری ایک ایسی بیماری ہے جس کی وجہ سے انسان دیگر مسائل کا شکار بھی ہو تا ہے۔ وہ خود کو معاشرے سے علیحدہ تصور کر تا ہے اور اپنی زندگی تنہا گزارنا پسند کر تا ہے۔ انسان اگر اس سب سے خود کو الگ بھی کرنا چاہے تو معاشرے میں ہم جیسے لوگ اسے یہ بھولنے نہیں دیتے۔ جس وجہ سے انسان تنہائی اختیار کر تا ہے اور وہ تنہائی اس شخص کو ذہنی مسائل کا شکار کرتی ہے۔ اور انسان موت کا انتخاب کر تا ہے۔ انور بھی ایک ایسا شخص تھا جس نے پہلے خود کو دنیا سے الگ کیا اور پھر جب اسے لگا کہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا راز جو اس نے اتنے سالوں سے دنیا سے چھپا کر رکھا تھا وہ شبنم کے سامنے عیاں ہونے جارہا ہے تو وہ اپنی جان لے لیتا ہے۔ انسانی فطرت میں شامل ہے کہ وہ کبھی بھی اپنے محبوب کے سامنے اپنی کمزوریاں نہیں لانا چاہتا۔ انور بھی ایسا ہی ایک شخص تھا جو شبنم کے سامنے اپنے راز کے عیاں ہونے کے ڈر سے خودکشی کا انتخاب کر تا ہے۔ اس رپورٹ میں معاشرے کے تلخ رویے پر تنقید کی گئی ہے اگر ہم جیسے لوگ ان لوگوں کا ساتھ دیں اور ان کو یہ محسوس نہ ہونے دیں کہ وہ عام لوگوں سے الگ ہیں یا ان میں کوئی کمی ہے تو بہت سے انور جمیل اپنی زندگی آسانی سے جی سکیں۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

حوالہ جات (References)

۱ رضاء اللہ حیدر، تحریری انٹرویو، شکیل امجد صادق، ۳۰ اپریل ۲۰۲۱ء

۲ رضاء اللہ حیدر، اوراقِ زیست، مخزونہ رضاء اللہ حیدر اوکاڑا، ص ۲

۳ ایضاً ص ۶

۴ ایضاً ص ۶

۵ ایضاً ص ۷

۶ ایضاً ص ۸

۷ ایضاً ص ۹

۸ ایضاً ص ۹

۹ ایضاً ص ۱۱

۱۰ رضاء اللہ حیدر، تحریری انٹرویو ایضاً ص ۱۰

۱۱ رضاء اللہ حیدر، اوراقِ زیست ایضاً ص ۱۲

۱۲ رضاء اللہ حیدر، تحریری انٹرویو ایضاً ص ۱۳

۱۳ ایضاً ص ۱۴

۱۴ ایضاً ص۱۶
۱۵ رضاء اللہ حیدر، اوراقِ زیست، ص ۱۴
۱۶ ایضاً ص۱۵
۱۷ ایضاً ص۱۷
۱۸ پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ''پسِ سر ورق''، ''ضیائے حرمین'' از رضاء اللہ حیدر (لاہور، القلم پبلشرز، 2017ء(
۱۹ پروفیسر ۱۸اڈاکٹر محمد ضیاء الحق ''پسِ سر ورق''، ''شاخ ثناء پر مہکے پھول'' از رضاء اللہ حیدر (لاہور، القلم پبلشرز،2020ء(
۲۰ ''اندرونی ورق''، ''شاخِ ثناء پر مہکے پھول'' از رضاء اللہ حیدر (لاہور، القلم پبلشرز،2020ء(
۲۱ ''اندرونی ورق''، ''ضیائے حرمین'' از رضاء اللہ حیدر (لاہور، القلم پبلشرز، 2017ء(
۲۲ رضاء اللہ حیدر، ''ضیائے حرمین''، (لاہور، القلم پبلشرز، 2017ء)، ص۹
۲۳ ایضاً
۲۴ رضاء اللہ حیدر، ''شاخِ ثناء پر مہکے پھول''، (لاہور، القلم پبلشرز،2020ء)، ص۱۵
۲۵ رضاء اللہ حیدر، ''زخم گلاب ہوئے''، (لاہور، نظمیہ پبلیکیشن، 2018ء)، ص۲۲